ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد❁
ڈاکٹر گلشن طارق❁❁
ڈاکٹر محمد سعید❁❁❁

پاؤلو کویلہو کا مترجم سعید احمد

Urdu translator of Paulo Coelho Saeed Ahmad

By *Dr. Rafaqat Ali Shahid, Asst. Prof., Department of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore.*

Dr. Gulshan Tariq, Dean of Languages, Lahore Garrison University, Lahore.

Dr. Muhammad Saeed, Assoc. Prof., Department of Urdu, Govt. College University, Lahore.

Abstracts

Paulo Coelho de Souza (b: 24 August 1947) is a Brazilian novelist. He wrote numerous novels in Portuguese. Almost all of his novels have been translated in English. He started writing novels in 1974 and till 2020, he had written 32 novels. Among them his famous novel *AlChemist* was translated twice in Urdu before. Now (Dr.) Saeed Ahmad translated his two other novels in Urdu named: *The Archer* and *By the River Piedra*, which are named in Urdu respectively as *Teer Andaz* and *Girya Bar kinar e Darya*, published from Misaal Publishers, Faisalabad in 2021. Saeed Ahmad is Head of the department of Urdu at Government College University, Faisalabad. He is well known for his critical works on Urdu Daastan (Urdu tales). On this particular topic, his two books have been published in the last few years which make him popular

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، لاہور گیریژن یونی ورسٹی، لاہور
❁❁ رئیس کلیۃ السنہ، لاہور گیریژن یونی ورسٹی، لاہور
❁❁❁ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

in the circle of Urdu literary society. Moreover he is a successful Urdu translator. His these two translations of Paulo Coelho's novels is an example of his good translation. Saeed Ahmad tried to use the literary translation method in these translations. He used to translate the English text of Paulo Coelho novels in literary manners of Urdu language. He used simple, elegant and easily understandable but purely literary Urdu language. In this respect it is so important that this kind of language is quite suitable for a literary translation.

Keywords: (Dr.) Saeed Ahmad, Paulo Coelho, English novels, Urdu translation, Urdu novel.

(۱)

اُردو میں ترجمہ نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اُردو کی پہلی نثری اَدبی تالیف ملا وجہی کی "سب رس" ہے جو فارسی تمثیل "حُسن و دل" کا ترجمہ ہے۔[۱] یوں اردو کی پہلی نثری تصنیف ہی ترجمہ تھی۔ تب سے آج تک دوسری زبانوں سے اُردو میں بلا مبالغہ ہزاروں ادبی تراجم وجود میں آ چکے ہیں۔ ان میں افسانوی نثری ادب کے تراجم کی تعداد سیکڑوں میں بنتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اُردو کی پہلی ادبی نثری تالیف "سب رس" کا تعلق ترجمے کے ساتھ افسانوی ادب سے بھی ہے۔ گویا اُردو میں نثری ادب کا آغاز افسانوی ترجمے سے ہوا۔ اس سے اُردو ادب میں قصے، کہانیوں، داستانوں اور افسانوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں کہانی کہنے اور سننے کو ہمیشہ سے بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

ماہرینِ ادب متفق ہیں کہ دنیا کے ہر ادب میں پہلے پہل کہانیاں لکھی گئیں۔ وہ اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کہانی کہنا اور سننا انسان کی دل چسپیوں میں اس وقت بھی شامل تھا جب ابھی تحریری ادب وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس حوالے سے کچھ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب انسان نے ابھی بولنا بھی شروع نہیں کیا تھا، تب بھی اسے کہانی بیان کرنا اور کہانی کے بارے میں جاننا اچھا لگتا تھا۔ دنیا کی قدیم ترین تحریروں میں شاہ خافری کے عہد کا افسانہ اور گل گامش کی داستان کے حوالے ملتے ہیں جو کم و بیش تین ہزار سال قبلِ مسیح کے زمانے کی کہانیاں ہیں۔[۲] اسی طرح کی ایک مثال اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں بنی بے شمار تصویریں اور نقش ہیں جو بظاہر زبانِ حال سے کہانی کے انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُردو میں ترجمہ نگاری کی روایت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کے آغاز سے بیسویں صدی کی

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ابتدائی دہائیوں تک اردو میں زیادہ تر تراجم فارسی اور عربی سے کیے گئے۔ ان میں سے افسانوی تراجم کی غالب تعداد فارسی سے اردو ترجموں کی ہے۔ انیسویں صدی کے تقریباً وسط سے انگریزی افسانوی ادب سے اردو میں ترجمے کرنے کی ضرورت کا احساس اجاگر ہونا شروع ہوا، چناں چہ اس دور کے معروف لکھنوی تاریخ دان سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر لکھنوی نے ڈاکٹر سیموئل جانسن (Dr. Samuel Johnson) کے ایک انگریزی ناول *The History of Rasselas prince of Abissinia* کا ترجمہ اردو میں ''تواریخ راسلس'' کے نام سے کیا جو ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا۔ [۳] اسے اب تک کی معلومات کے مطابق انگریزی کے افسانوی ادب کا پہلا اردو ترجمہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک متعدد انگریزی ناولوں کے اردو ترجمے شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۴۰ء تک چلتا رہا۔ انگریزی کے ان ترجمہ شدہ ناولوں میں بڑی تعداد جارج رینالڈس اور مارس لیبلانک کے عام پسند (popular) جاسوسی ناولوں کی تھی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں پاپولر انگریزی ناول نگاروں کے اردو ترجمے کرنے والوں میں تیر تھ رام فیروز پوری نے کمال شہرت حاصل کی۔

۱۹۳۰ء کے بعد نئے ادب، پھر ترقی پسند ادب اور حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریکوں کی تحت یورپی زبانوں سے اردو میں ترجمہ نگاری کی نئی ادبی روایت کا آغاز ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دوران یورپی زبانوں سے اردو میں سیکڑوں ادبی تراجم وجود میں آچکے ہیں۔ اردو ترجموں کی اس تازہ روایت کی تقریباً ایک صدی کے عرصے میں صرف انگریزی سے جو ادبی تراجم اردو میں ہوئے، ان کی تعداد ہی سیکڑوں میں بنتی ہے۔ اب اکیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں میں ان تراجم کی تعداد میں اضافہ دیکھنے میں آرہاہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی کیا جارہاہے کہ آئندہ اس رجحان میں مزید اضافہ ہوگا۔

اس حوالے سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس روایت کے دوران انگریزی سے اردو میں جتنے بھی ادبی ترجمے منظر عام پر آئے ہیں، ان میں اکثریت افسانوی ترجموں کی ہے۔ ان میں ایسے تراجم کی تعداد نسبتاً کم ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے، جب کہ زیادہ تر ترجمے رسائل و جرائد کے ذخیروں میں دفن ہیں۔ اکیسویں صدی شروع سے ایسے ترجموں کی تعداد میں بھی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ماہرین اور شائقینِ ادب نے اس صورت حال کو حوصلہ افزا قرار دیاہے۔

اُردو میں ادبی تراجم کی روایت کے اس مختصر پس منظر کے بعد اب موضوعِ زیرِ بحث کی طرف آتے ہیں۔ انگریزی کے افسانوی ادب سے اردو میں ترجمے کی اس تازہ روایت کے جدید ترین مظاہر میں سے دو تازہ ترین ترجموں کے جائزے پر یہ مضمون نما مقالہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا ترجموں کا فنی جائزہ لینا مقصود ہے۔ یہ ترجمے معروف پرتگالی ناول نگار پاؤلو کویلہو کے دو مختصر ناولوں کے ہیں۔ یہ ترجمے سعید احمد نے کیے ہیں

اور مثال پبلشرز فیصل آباد سے محمد عابد کے اہتمام سے شائع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں۔

(۲)

پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد خاموش طبع اور چپ چاپ کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، اسی لیے وہ اُردو کو بعض اچھی تحریریں دینے میں کام یاب رہے ہیں۔ اُردو داستان کے حوالے سے ان کی کتابیں: "داستانیں اور حیوانات" اور "داستانیں اور تصوّرِ خیر وشر" شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک استاد بھی ہیں اور شعبۂ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد میں گزشتہ ۲۰ سال سے تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کے تراجم پر مشتمل دو کتابیں شائع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت سے بھی متّصف ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد کے مذکورہ بالا تراجم پر مشتمل جو تازہ کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں، وہ معروف پُرتگالی ناول نگار پاؤلو کویلھو کے دو ناولوں کے اُردو تراجم ہیں۔ ان میں سے ایک ناول کا ترجمہ اُنھوں نے "تیر انداز" کے نام سے کیا ہے۔ یہ پاؤلو کویلھو کے پُرتگالی ناول کے انگریزی ترجمے *The Archer* کا ترجمہ ہے اور دوسرا ناول "گِریہ بر کنارِ دریا" ہے جو کویلھو کے ایک اَور ناول کے انگریزی ترجمے *By The River Piedra* کا اُردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا کہنا ہے کہ *The Archer* کویلھو کا سب سے مختصر ناول ہے۔ اس کا اندازہ اس کے اُردو ترجمے سے بھی ہوتا ہے جو بیش تر شذرات کے انداز میں ترتیب دینے کے باوجود سو صفحات میں سمٹ آیا ہے۔ اگر اسے مسلسل عبارت کی صورت میں کتابت کرایا جائے تو اس کی ضخامت تیس چالیس صفحات سے زیادہ نہیں ہو گی۔ دوسرے ناول کی ضخامت اُردو میں ۱۶۶ صفحات ہے۔ دونوں ناول فیصل آباد کے معروف اشاعتی ادارے مثال پبلشرز نے ۲۰۲۱ء میں شائع کیے۔

پاؤلو کویلھو ڈی سوزا (Paulo Coelho de Souza) ایک پرتگالی ناول نگار ہیں۔ وہ ۲۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو برازیل میں پیدا ہوئے۔ انھیں بسیار نویس ناول نگار کہنا بجا ہے۔ اُنھوں نے ناول نگاری کا آغاز ۱۹۷۴ء میں کیا اور ۲۰۲۰ء تک اُن کے ۳۲ ناول شائع ہو چکے تھے۔ اُن کے تقریباً سبھی ناولوں کے انگریزی زبان میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔[۴] ڈاکٹر سعید احمد نے اُن کے جن دو ناولوں کا اُردو میں ترجمہ کر کے چھپوایا ہے، اُن میں سے *By The River Piedra* کا اصل پرتگالی متن ۱۹۹۴ء منظرِ عام پر آیا، جب کہ دوسرے ناول *The Archer* کا اصل پرتگالی متن ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔

جیسا کہ بیان ہوا ہے کہ "تیر انداز" کے نام سے پیشِ نظر ناول کویلھو کے ناول *The Archer* کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس کے "عرضِ مترجم" میں ڈاکٹر سعید احمد نے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ یہ پاؤلو کویلھو کا مختصر ترین ناول ہے۔ یہ ایک ماہر

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

تیر انداز کی سرگزشت ہے جس کے واقعات اور حالات تیر اندازی کی تعلیم کے دوران واضح ہوتے جاتے ہیں۔ مترجم کے مطابق: ”چوں کہ پاؤلو خود بھی بہت اچھے تیر انداز ہیں، اس لیے یہ ناول ان کے فکر و فن کا خوب صورت مرقّع بن گیا ہے۔“(۵)

”گریہ بر کنارِ دریا“ بھی زیادہ طویل ناول نہیں ہے لیکن ”تیر انداز“ کے مقابلے اس کی ضخامت زیادہ ہے، پھر بھی اس ناول کا اُردو ترجمہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات میں سمٹ آیا ہے۔ سعید احمد کے نزدیک یہ ناول اُن کے لیے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ یہ وہ پہلا ناول ہے جس کا ترجمہ اُنھوں نے اُردو میں کیا ہے۔ اس ناول کے ترجمہ کرنے کا پس منظر اُنھوں نے اپنے ”عرضِ مترجم“ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو دل چسپ بھی ہے اور حقیقت کُشا بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> آج سے بیس سال پہلے جب گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں میرا تقرر بطور لیکچرار ہوا تو کالج کا 'ٹی کلب' علمی و ادبی سرگرمیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ 'ٹی کلب' میں مختلف شعبہ جات کے قابل اساتذہ کی ایک کہکشاں فروزاں تھی۔ ہم خیال دوستوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھی تھیں۔ میں شروع ہی سے پروفیسر غلام غوث صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔
>
> پائلو کویلھو کا نام میں نے پہلے پہل انہی [کذا-انھی] صحبتوں میں سُنا۔ سب سے پہلے اس ناول کا ذکر پروفیسر رفیق اختر ڈوگر صاحب نے کیا اور ناول کے چند خوب صورت اقتباسات کے ترجمے پر مجھ ناچیز سے مشورہ بھی کیا۔ پائلو کویلھو کا شہرۂ آفاق ناول ”الکیمسٹ“ میں نے بہت بعد میں پڑھا۔ ”الکیمسٹ“ کے اُردو زبان میں کئی تراجم ہو چکے ہیں لیکن ”ریور پیڈرا...“ کا کوئی ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا [کذا- گذرا] تھا... اور میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں اس خوب صورت اور فکر انگیز ناول کا اُردو ترجمہ کروں۔(۶)

تحریر چاہے کسی صنفِ اَدب سے تعلّق رکھتی ہو، لکھاری کی شخصیّت اور فکر و ذہن اُس میں اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ، جملے کی ساخت اور ایمان داری کے تقاضوں کا لحاظ وہ خصوصیات ہیں جو کسی تحریر کی خوب صورتی اور تاثّر میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ان میں ایمان داری اور سچّائی کا عنصر زیادہ اہم ٹھہرتا ہے، کیوں کہ اس کے لیے کسی گہرے تجزیے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ یہ تحریر کی سطح پر صاف نظر آجاتا ہے۔ بعض لکھنے والے اپنے تخلیقی، علمی یا

ترجمے کے کام کو غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور کچھ اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لے کر اپنے لیے ایک طرح کی داد و تحسین کے حصول کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ ادب نویس اپنی تخلیقات کا پس منظر بیان کرنے سے پہلو تہی بھی کرتے ہیں۔ یہ تمام اُمور ادبی فن پارے کی تخلیق میں ایمان داری اور سچّائی کے جوہر کی نفی کرتے ہیں۔ بہت کم ادب نویس ایسے ہیں جو کُھلے دل کے ساتھ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس اعتراف سے اُن کی تحریر میں صداقت و سچّائی اور ایمان داری کی وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ سعید احمد کو اس حوالے سے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ''گریہ بر کنارِ دریا'' اُن کا پہلا ترجمہ شدہ ناول ہے۔ اس ترجمے میں اُردو زبان و بیان کی جن خوبیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اُن کی تفصیل اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ہے کہ ان اوصاف کے باوجود اپنی ترجمہ نگاری اور اس ترجمے کے بارے میں سعید احمد بڑی صاف گوئی سے یہ اعتراف کرتے ہیں:

> میں انگریزی زبان کا معمولی درک رکھتا ہوں۔ مترجمی میرا پیشہ نہیں شوق ہے۔ میں نے اس سے پہلے چند شارٹ اسٹوریز کا اُردو ترجمہ کیا تھا لیکن پورے ناول کا ترجمہ ایک محنت طلب اور صبر آزما کام تھا، چناں چہ کئی دفعہ ترجمے کا کام شروع کیا اور چھوڑ دیا۔ (۷)

یہی نہیں، اُنھوں نے اس ناول کے اُردو ترجمے کے بارے میں مزید یہ لکھا کہ:

> 'ریور پیڈرا...' کا کوئی ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا [کذا- گذرا] تھا (حال ہی میں فہیم صابری صاحب کا ایک ترجمہ نظر پڑا ہے)۔ (۸)

اگر وہ چاہتے تو فہیم صابری کے اُردو ترجمے کا ذکر نہ کرتے۔ یوں قارئین کا وہ بڑا حلقہ جس کی نظر سے فہیم صابری کا اُردو ترجمہ نہیں گذرا، وہ سعید احمد کو ہی پائلو کوئیلھو کے اس ناول کے پہلے اُردو مترجم کے طور پر جانتا۔ اس طرح کی کئی مثالیں تاریخِ اَدب سے پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن سعید احمد کے اندر موجود سچّے ادیب اور اُن کی شخصی ایمان داری نے ایسا کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس سے سعید احمد کو کچھ فرق نہیں پڑا۔ ہاں، اس سے اُن کی شخصیّت کی ایک خوبی ضرور واضح ہو گئی اور اُن کے ترجمے میں صداقت و ایمان داری کے جوہر کا تاثّر شامل ہو گیا۔

اسی طرح کی ایک اَور مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے جس میں سعید احمد نے اس ناول کے ترجمے میں اپنے ایک شاگرد کی معاونت اور کاوشوں کا کُھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس بیان سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سعید احمد نے اس ناول کے صحیح ترجمہ کرنے میں کتنی اور کیسی کاوش کی ہے:

(اس) ناول کا ترجمہ ایک محنت طلب اور صبر آزما کام تھا، چناں چہ کئی دفعہ ترجمے کا کام شروع کیا اور چھوڑ دیا۔ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اگر میرے شاگردِ عزیز مشتاق بزمی اس کام میں میرے شریک نہ ہوتے۔ چوں کہ اس ناول کا ایک مرکزی کردار عیسائی ہے اور ناول کے بیشتر مباحث اور مکالمات کیتھولک اِزم سے متعلق ہیں، اس لیے مشتاق بزمی (جو کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں) سے اس ناول کے پیرایۂ اظہار اور موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوتی رہی۔ میں اس موقع پر اپنے مودّب شاگرد اور شریکِ کار کا خصوصی شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔[۹]

(۳)

کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے عام طور پر تین طریقے رائج ہیں: (الف) لفظی ترجمہ، (ب) آزاد ترجمہ، اور (ج) تخلیقی ترجمہ۔ سعید احمد کے ان دونوں تراجم کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تخلیقی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، چناں چہ دونوں ناولوں میں اگر واضح طور پر ترجمہ ہونے کا نہ لکھا ہوتا تو عام قاری انھیں طبع زاد اَدبی ناول ہی سمجھتا۔ یہاں سعید احمد کے ان دونوں تراجم کو تخلیقی ترجمے کے معیار سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں تخلیقی ترجمے سے متعلّق جو لکھا ہے، اسے یہاں نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہو گا۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

ترجمہ بذات خود فن پارہ ہے لیکن اسے ترجمہ کہلانے کا حق اسی وقت ہے جب وہ اصل کی کیفیت اور احساس کو ممکن ترین حد تک دوبارہ خلق کر سکے۔[۱۰]

جب ہم شمس الرحمٰن فاروقی کی اس بات کا اطلاق سعید احمد کے پیش نظر ترجموں پر کرتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے سعید احمد نے اس اصول کا کافی حد تک لحاظ رکھا ہے، بلکہ بعض مقامات پر تو وہ اس کے لیے کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ذیل کے دو اقتباسات اس دلیل کے حق میں پیش کیے جا رہے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

میں یہ جانتی ہوں، میں نے اپنے آپ سے کہا، مجھے معلوم تھا کہ وہ میری زندگی بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے دماغ نے مجھے تنبیہ کی لیکن میرے دل نے اس کی بات پر

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

> کان نہ دھرے۔ پہلے بھی میں نے تھوڑے حصول کے لیے بڑی قیمت ادا کی ہے۔ مجھے مجبور کیا گیا کہ میں ان بہت سی چیزوں سے منکر ہو جاؤں جو میں پانا چاہتی تھی۔ میں ان بہت سی راہوں کو چھوڑ دوں جو میرے سامنے کھلی تھیں۔(۱۱)

> شروع میں مَیں حیران ہوا۔ میں دعا کیا کرتا کہ اے القدس! مجھ پر منکشف ہو۔ میں نے بہت سے بیماروں پر اپنا ہاتھ پھیر کر ان کو شفایاب کیا۔ میری شہرت پھیلنے لگی اور ہر صبح درس گاہ کے دروازے پر لوگوں کی قطاریں لگ جاتیں جو میری مدد چاہتے تھے۔ ہر آلودہ اور بدبودار کوڑھی میں مَیں نے حضرت مسیح کے زخموں کو دیکھا۔(۱۲)

شمس الرحمٰن فاروقی نے تخلیقی ترجمہ کی اس نوع کے لیے "خلاّقانہ" ترجمے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ خلاّقانہ شان کا مطلب اگر یہ ہے کہ جس طرح تخلیق وجود میں لائی جاتی ہے، ترجمہ بھی اسی نقطۂ نظر سے کیا جائے تو ممکن ہے کہ ان معنوں میں یہ بات کافی حد تک ٹھیک نہ ہو۔ یہاں ایک مرتبہ پھر شمس الرحمٰن فاروقی ہماری دست گیری کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسی مضمون میں اس خلاّقانہ ترجمے اور اس کے ساتھ کامیاب ترجمے کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو (یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو) اور خلاّقانہ شان رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کا یکجا ہونا تقریباً ناممکن ہے لیکن ترجمے میں کامیابی کا تصور بہت وسیع ہے اور اگرچہ کوئی بھی شخص اس کامیابی کی پوری وسعت کا احاطہ نہیں کر سکتا، اچھے اور خوش نصیب مترجم اس کے بڑے حصے کا احاطہ ضرور کر سکتے ہیں۔ کامیاب ترجمہ اس معنی میں خلاّقانہ نہیں ہوتا کہ مترجم اصل کی جگہ اس کے برابر کوئی دوسری نظم یا ناول لکھ دیتا ہے۔ مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ خلق کرتا ہے اور اس طرح نہیں کہ پہلے وہ اصل فن پارے کو مار ڈالے اور پھر اسی کو اپنی زبان میں دوبارہ زندہ کرے اور نہ اسے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ خود اصل فن پارے کا مصنف ہے اور اب اس فن پارے کو وہ ترجمے والی زبان میں لکھ رہا ہے۔(۱۳)

شمس الرحمٰن فاروقی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ترجمے کی ایک خوبی خلاّقانہ ترجمے کو بھی قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ خلاّقانہ ترجمے سے ان کی مراد کیا ہے۔ ان کے مطابق جو ترجمہ اصل کے مطابق بھی ہو، کہ ترجمہ لگے، اور ساتھ ہی اس کا انداز و اسلوب تخلیق سے بھی قریب تر ہو تو اسے "خلاّقانہ

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

شان" رکھنے والا ترجمہ کہا جاسکتا ہے۔ جب ہم فاروقی صاحب کے اس بیان کا اطلاق سعید احمد کے ترجموں پر کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ترجمہ نگاری میں یہ خصوصیت پیدا کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کی بھرپور سعی کی ہے، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

خلاّقانہ یا تخلیقی ترجمے کی بات ہو گئی لیکن کامیاب ترجمے کی بات ابھی ادھوری ہے۔ اچھے اور کامیاب ترجمے کی بات کے حوالے سے ایک بار پھر شمس الرحمٰن فاروقی کے اسی مضمون میں ان کا ایک اَور بیان نظر آتا ہے جس میں انھوں نے بلیغ انداز میں کامیاب ترجمے کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> (ترجمہ نگاری کے) سلسلے میں کوئی حتمی قاعدہ نہیں ہو سکتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مترجم دونوں زبانوں (یعنی اصل زبان اور ترجمے والی زبان) کے آہنگ کو جتنی خوبی سے سن سکے گا، اتنا ہی عمدہ ترجمہ وہ کر سکے گا۔ [۱۴]

یہ آہنگ والی بات بھی انھوں نے خالص تخلیقی انداز کے بارے میں کہی ہے اور خوب ہے۔ اب اسی حوالے سے سے معروف نقاد اور مترجم ممتاز شیریں کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ ممتاز شیریں محض نقّاد نہیں تھیں، بلکہ ایک کام یاب ترجمہ نگار بھی تھیں۔ انھوں نے انگریزی سے متعدد کہانیاں اور افسانے اردو میں ترجمہ کیے جنھیں تلاش کر کے ڈاکٹر تنظیم الفردوس نے مرتب کر دیا ہے۔ ممتاز شیریں کے تراجم کی یہ کتاب اسلام آباد سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں افسانوی تراجم پر ان کا ایک مضمون بھی بطورِ دیباچہ شامل ہے۔ اس مضمون میں ممتاز شیریں نے افسانوی ترجمہ نگاری کے بعض اصول متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ذرا وہ بھی دیکھتے چلیے:

> ایک واقعی اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے جس میں نہ صرف اصل کی روح برقرار ہے بلکہ اس میں مصنف کے اسلوب کا عکس تک اُتر آئے۔ اس لحاظ سے کسی ترجمے کے اچھے یا بُرے ہونے کی بات سمجھ میں آسکتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ترجمہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل معلوم ہوتا ہے تو یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی اور یہی ایک اچھے ترجمے کی پہچان بھی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی ترجمہ اصل سے بہتر کیسے ہو سکتا ہے؟ خوب صورت بنا دینا ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ خامی ہے۔ [۱۵]

اچھے اور کام یاب ترجمے کے بارے میں اردو کے دو بڑے نقادوں شمس الرحمٰن فاروقی اور ممتاز شیریں کے ان خیالات سے واقف ہونے کے بعد جب ہم سعید احمد کی ترجمہ نگاری پر نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کام

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

یاب ترجمے کے ساتھ خلاقانہ یا تخلیقی ترجمے کی وہ شان بھی پائی جاتی ہے جس کی جانب مذکورہ بالا دونوں ماہرین نے اشارہ کیا ہے، یعنی ترجمہ ہوتے ہوئے ترجمہ نہ ہونے کا احساس اور ترجمے میں تخلیقی جوہر۔ اتّفاق سے سعید احمد کے ترجموں میں یہ دونوں رنگ ایک دوسرے کے ساتھ شِیر و شکر ہوئے نظر آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دو تین مختصر اقتباسات ملاحظہ کرنے سے اس دعوے کی صورت حال واضح ہو سکتی ہے:

> اس نے میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہا، میرے دل نے ایک بار پھر خبرداری کی گھنٹی بجائی۔

> ایک دن… خزاں کا موسم تھا۔ بالکل جیسے آج کل ہے اور تب ہماری عمریں لازماً دس برس کی ہوں گی۔ میں تمھارے ساتھ اس بلند و بالا عمارت میں بیٹھا تھا جہاں پر شاہ بلوط کا ایک بڑا سا پیڑ تھا۔[۱۶]

> میں بھی مشینی انداز میں گانے لگی، لیکن دھیرے دھیرے مجھے یوں لگا جیسے موسیقی نے مجھے مسحور کر دیا ہو، جیسے اس کی اپنی بذاتِ خود ایک زندگی ہو۔ وہ مجھے مدہوش کر رہی تھی۔ سردی کم آزار محسوس ہونے لگی تھی۔ بارش بھی اب زیادہ تکلیف دہ نہ تھی۔[۱۷]

کسی بھی زبان سے ترجمے کی صورت میں سب سے زیادہ جس بات پر دھیان دیا جاتا ہے، وہ جملے کی ساخت ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے جملے کی ساخت اور الفاظ کے چناؤ سے وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ عبارت کی روانی کا تسلسل اس بات کی غمازی کرتا ہے مصنف نے ترجمے میں تخلیق کی شان پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں شمس الرحمٰن فاروقی اور ممتاز شیریں نے جو جو باتیں اچھے اور کامیاب ترجمے کے بارے میں کی ہیں، ان میں یہ بات مزید تشریح طلب ہے کہ ترجمے میں خلاّقانہ شان ہونی چاہیے، اور یہ کہ ترجمہ تخلیق معلوم ہو تو یہ اس کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ اس حوالے سے جو بات خاص طور پر کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ترجمے میں ترجمہ پن نظر آنا چاہیے یا ترجمے کو ترجمہ نظر آنا چاہیے۔ جب ہم اس کی مزید وضاحت کے طلب گار ہوتے ہیں تو یہاں بھی شمس الرحمٰن فاروقی ہماری راہ نمائی کے لیے موجود ہیں۔ وہ ممتاز نقاد محمد حسن عسکری کے ایک بیان کی وساطت سے اس کی توضیح کرتے ہیں۔ وہ اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> محمد حسن عسکری، جنھوں نے خود فرانسیسی اور انگریزی سے بہت عمدہ تراجم کیے ہیں، کہا

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

> کرتے تھے کہ ترجمے میں "ترجمہ پن" کا ہونا کوئی عیب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ترجمے کے ذریعے ترجمے والی زبان کے نئے امکانات منکشف ہوتے ہیں۔ ترجمہ دراصل مترجم کو دوطرفہ جنگ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ جنگ اس زبان سے بھی ہوتی ہے جس سے ترجمہ کیا جارہاہے اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ ہو رہاہے۔(۱۸)

اوپر جتنے اقتباسات درج کیے گئے ہیں، ان میں کہی گئی باتوں سے کئی اُمور کی وضاحت ہوگئی ہیں لیکن پھر بھی دو باتیں ایک طرح سے گڈمڈ سی ہوتی نظر آتی ہیں۔ ظاہر میں اس امکان کی وضاحت نہیں ہو رہی کہ اچھے ترجمے میں بہ یک وقت تخلیقی یا خلّاقانہ شان کے ساتھ ترجمہ پن کی موجودگی کیسے ممکن ہے اور اس بات کا صحیح مطلب کیا ہے؟ بظاہر تو یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں لیکن کیا حقیقت میں دونوں ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہوئی نظر آتی ہیں؟ اوپر کے بیانات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ترجمے میں ترجمہ پن اس غرض سے جھلکنا چاہیے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ ترجمہ ہے، تخلیق نہیں، اور ترجمے میں تخلیقی تاثر بھی اس لیے موجود ہونا چاہیے، تاکہ پڑھنے والوں اور جائزہ لینے والوں کو یہ پتا ہو کہ یہ ادبی ترجمہ ہے، ادب کے علاوہ کسی اَور موضوع یا میدانِ علم کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس بات کو ذرا وضاحت کے ساتھ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس طرح بیان کیا ہے:

> اصل زبان اور ترجمے والی زبان کے لیے اس کا جبلی اور باطنی احساس اور جس مصنف کا ترجمہ وہ کر رہاہے، اس کے پورے کلام کے بارے میں مترجم کا تاثر، یہ سب باتیں مختلف طرح سے ترجمے پر اثرانداز ہوتی ہیں۔(۱۹)

اب بات کچھ واضح ہوئی ہے اور ہم آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ اصل میں خلّاقانہ یا تخلیقی تاثر کے ساتھ ہی ہونا چاہیے لیکن چوں کہ ترجمہ کرنے والا خود بھی اپنا ایک تاثر، تخلیقی نظر اور اسلوب رکھتا ہے، اس لیے ان سب کا ترجمے کی زبان اور اسلوب پر اثرانداز ہونا لازمی اور ضروری ہے، چناں چہ ترجمے میں ذاتی یا انفرادی تعصبات لازمی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ تعصبات ترجمے کے تخلیقی انداز اور رنگ میں بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس ساری بحث اور اچھے ترجمے کے خصائص پر نظر ڈالنے کے بعد جب ہم سعید احمد کے ترجموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے ہاں ہمیں اس کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> خدا کو پانے کے لیے تمھیں صرف اپنے آس پاس دیکھنا ہے، لیکن اُس سے ملاقات آسان نہیں۔ خدا جس قدر ہمیں اپنے اسرار میں شریک ہونے کو کہتا ہے، ہم اتنا ہی راہ

سے بھٹک جاتے ہیں۔ وہ ہمیں مسلسل اپنے خوابوں اور دلوں کی پیروی کرنے کا کہتا ہے اور یہ اُس وقت مشکل ہو جاتا ہے جب ہم کسی اَور ڈھب پر زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہوں۔ بالآخر ہم دریافت کر لیتے ہیں اور حیران بھی ہوتے ہیں کہ خدا تو ہماری خوشی چاہتا ہے، کیوں کہ وہ تو باپ ہے۔ [۲۰]

ایک صبح میں نے مسودہ تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ میں نے ایک کار کی آواز سنی۔ میرا دل اُچھلنے لگا لیکن میں یقین نہ کرنا چاہتی تھی، مجھے ایک بار پھر آزادی کا احساس ہوا۔ میں دنیا میں واپس جا کر ایک بار پھر اس کا حصہ بننے کے لیے تیار تھی۔ بدترین دور گزر چکا تھا، اگرچہ اداسی ابھی باقی تھی لیکن میرا دل صحیح تھا۔ اپنے کام سے نظریں اٹھائے بغیر میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ [۲۱]

اوپر شمس الرحمٰن فاروقی نے محمد حسن عسکری کا جو بیان درج کیا ہے، اس میں ترجمہ پن کی بات ہوئی ہے۔ ان کے مطابق ترجمے میں ترجمہ پن کی جھلک دکھائی دینی چاہیے یا نظر آنی چاہیے۔ یہ کامیاب ترجمے کی کُنجی ہے۔ اس حوالے سے معروف فکشن نگار، مترجم اور نقاد انتظار حسین کا بیان بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ بات بہت کہی جاتی رہی ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ ترجمہ نہ معلوم ہو مگر ترجمہ کیوں نہیں معلوم ہو۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری نثر کا ایک اجنبی نثر سے پالا پڑا ہے۔ اگر ترجمہ کرنے والے نے ترجمہ کرتے ہوئے غیر نثر کا ذائقہ بالکل گم کر دیا اور مصنف کے اسلوب کو بھی اپنی روایت میں غتربوت کر دیا تو اس شاہ کار کا تو بھرتا کیا ہی اپنی زبان کو اور اپنے شعورِ نثر کو بھی کیا فیض پہنچایا۔ [۲۲]

اب محمد حسن عسکری شمس الرحمٰن فاروقی اور انتظار حسین کے ان تمام بیانات سے بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ایک اچھے ترجمے میں جہاں اصل کی چھاپ قائم رہنی چاہیے، وہاں ترجمے کو ترجمہ بھی نظر آنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ترجمے میں تخلیق کی شان بھی پیدا ہو جائے تو یہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کی مثالیں سعید احمد کے تراجم میں نظر آتی ہیں، چناں چہ ان کے تراجم پڑھتے ہوئے کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ نہیں تخلیق ہے اور کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب ترجمہ نگار کی طرح دوسری زبان سے سے بیانات واقعات کو ترجمہ کرتے جا رہے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ان کے زیرِ نظر دونوں ترجموں میں موجود ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر محض نمونے کے

طور پر یہاں اس کی صرف دو مختصر مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے:

لڑکے نے دیکھا کہ اس سے بحث بے سود ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اس شخص کو بڑھئی کی کار گاہ میں لے جاؤں تا کہ وہ خود دیکھ سکے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ تنسو ئیا اپنے گھر کے پچھواڑے اپنی دکان میں تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے مڑا کہ کون آیا ہے، لیکن جب اس کی نظر اجنبی کے لمبے سے بورے پر پڑی تو اس کی مسکراہٹ اس کے لبوں ہی میں دب گئی۔ (۲۳)

ایسے لوگوں کی رفاقت اختیار کرو جو ایسا کبھی نہ کہتے ہوں کہ ''بس بہت ہو گیا۔ آپ اور کچھ نہیں''، کیوں کہ جیسے سرما کے بعد بہار ضرور آتی ہے تو کچھ بھی آخری نہیں ہوتا۔ اپنا ہدف حاصل کرنے کے بعد گزشتہ راہ کے تجربات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئے سفر کا آغاز کرو۔ ایسے لوگوں کی رفاقت اختیار کرو جو جھومتے گاتے، قصّے کہانیاں سناتے اور زندگی سے لُطف اندوز ہوتے اپنی آنکھوں میں مسرّت کی چمک رکھتے ہوں، کیوں کہ مسرّت ایک متعدی شے ہے جو دوسروں کو ذہنی دباؤ، تنہائی اور مشکلات سے مفلوج ہونے سے بچاتی ہے۔ (۲۴)

ترجمے کی صورت میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، وہ ترجمے کا اسلوب ہے۔ عام طور پر اسلوب سے پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ترجمہ کس سطح اور کس معیار کا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ترجمہ نگار میں ادب کا ذوق کس درجے کا ہے اور ترجمہ کرنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ ترجمہ نگاری کی اس مشکل کی جانب سجاد باقر رضوی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے اسی مضمون میں ان کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے:

دو تہذیبیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ (۲۵)

سجاد باقر رضوی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انتظار حسین نے اس پر مزید اضافہ کیا ہے اور لکھا ہے:

ایسی صورت میں دو تہذیبیں ہی نہیں، دو نثری روایتیں بھی ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نثری روایت کا ذائقہ ترجمے میں ضائع نہ ہو جائے اور اس نثری روایت کے اندر لکھنے والے کا جو اپنا ایک اسلوب ہے، وہ بھی جس

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

حد تک منتقل ہو سکتا ہے، منتقل ہو جائے۔ (۲۶)

گویا اچھے ترجمے کی خوبی یہ بھی ہے کہ اصل اور ترجمے کی زبانوں کے اسلوب بہت حد تک قائم رہیں، یعنی ترجمہ اصل سے قریب بھی ہو اور اس میں تخلیقی شان بھی پائی جاتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ ترجمہ شدہ زبان کی معاشرت، سماج، ثقافت اور افرادی رویہ بھی ترجمے میں کچھ نہ کچھ اپنی جھلک ضرور دکھاتے نظر آئیں۔ اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ یہ بات کرتے ہیں کہ ترجمے میں بہر حال معنی مکمل طور پر منتقل نہیں ہوتے بلکہ بہت کچھ معنی ضائع ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> جب ہمارا سابقہ ایسی زبان سے پڑتا ہے جس سے ہم نابلد ہوں۔ ایسی صورت میں اجنبی زبان کے علامیوں کو سیکھنا اور ان اجنبی علامیوں کو اپنے مانوس علامیوں میں منتقل کرنا پڑ جاتا ہے۔
>
> علامیوں کو اس طرح منتقل کرنے میں ان کے معنی کا کتنا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مثالی صورتِ حال کی رو سے تو یہ ہونا چاہیے کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو، خاص کر اگر تمام زبانوں کی ماں ایک ہی زبان ہے لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے، کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کے اعتبار سے بھی۔ (۲۷)

فاروقی صاحب نے ترجمے کا بہت اعلا معیار سامنے رکھ کر یہ بات لکھی ہے جس کا حصول اور منتہا بظاہر بہت مشکل ہے۔ بہر حال فاروقی صاحب کی اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ ترجمہ کرتے وقت علامیوں اور معنی کے نقصانات کو جس قدر کم کیا جا سکے، وہ اچھے ترجمے کی خوبی بن جاتی ہے۔

اوپر کی بحث کو سامنے رکھ کر جب ہم سعید احمد کے دونوں ترجموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مترجم کے ہاں اسلوب اور ثقافت کے دونوں مظاہر پوری طرح جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ وہ یہ کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ ثقافت اور اسلوب کے ساتھ معنی بھی پوری طرح اردو میں منتقل ہو جائیں۔ اس حوالے سے یہاں حسب سابق دو مختصر مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ ان نکات کی تشریح کے لیے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:

> تمھیں اپنے ہدف کو ضرور سمجھنا چاہیے۔ تمھیں اپنے آپ سے مستقل یہ پوچھتے رہنا چاہیے ”اگر میں ہدف ہوتا تو کہاں ہوتا؟ نشانے پر ہونا کیسا لگتا ہے اور تیر انداز کو قرار واقعی عزت دینی چاہیے؟“

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

ہدف کا وجود تیر انداز کے وجود سے ملزوم ہے۔ کون سی بات ہے جو اس کا جواز فراہم کرتی ہے کہ اس کا وجود تیر انداز کی خواہش کا نشانہ بنے۔ بصورتِ دیگر تو وہ ایک بے جان شے ہے، کاغذ یا لکڑی کا ایک بے حیثیت ٹکڑا۔ جس طرح تیر ہدف کی طلب کرتا ہے، بالکل اسی طرح ہدف بھی تیر کا مشتاق ہوتا ہے، کیوں کہ یہ تیر ہی ہے جو اس کے وجود کو با معنی بناتا ہے۔ اب وہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں رہتا، تیر انداز کے لیے تو وہ مرکزِ کائنات ہوتا ہے۔(۲۸)

کمان آلۂ موسیقی کی مانند ہے اور اس کی آواز رسّی میں جلوہ گر ہے۔ کمان کی رسّی ایک بڑی شے ہے لیکن تیر کا محض ایک سرا ہی اسے چھوتا ہے اور تیر انداز کا تمام تر علم اور تجربہ اسی ایک چھوٹے سے نقطے پر مرتکز ہونا چاہیے۔ اگر یہ (تیر) چھوڑنے کے خط سے ذرا سا بھی دائیں بائیں یا اوپر نیچے ہو جائے تو یہ کبھی نشانے پر نہ لگے گا۔(۲۹)

دونوں ناولوں میں ترجموں کی مختلف عبارتوں سے اُردو زبان، اس کی لفظیات اور ذخیرۂ الفاظ پر مترجم کی ماہرانہ گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ اصل کے مطابق اُردو کے مناسب حال الفاظ ڈھونڈ کر لانے کی کامیاب تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی ترجمہ نگاری کی اہم خاصیت ہے جو ان کے اُسلوب میں بھی جاری و ساری نظر آتی ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر اس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ورنہ یہ انداز اور ادبیّت ان دونوں تراجم کے خاص اوصاف میں سے ہیں:

جب ایک دفعہ تیر چھوڑ دیا جائے تو تیر انداز ہدف تک تیر کی پرواز کا تعاقب کرے۔ تیر چھوڑنے کے لمحے تک جو تناؤ تھا، اب اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اس لیے تیر انداز اپنی نظریں تیر کی پرواز پر گاڑے رکھتا ہے لیکن اس کا دل مطمئن اور مسرور ہوتا ہے۔(۳۰)

ایک تیر انداز اس وقت سیکھتا ہے جب وہ راہِ کمان کے سارے اصول فراموش کر کے کُلّیتاً اپنی جبلّت پر تکیہ کرنے لگتا ہے لیکن اس مقام تک رسائی کے لیے وہ تمام اصول و ضوابط فراموش کر دے، اس لیے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ قوانین کا احترام کرے اور ان سے کماحقہٗ واقف ہو، اور جب وہ اس ارفع مقام تک پہنچ جاتا ہے، تب وہ

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

> کچھ سیکھنے کے لیے آلات کا محتاج نہیں رہتا۔ اب اسے کمان، تیروں اور ہدف کی احتیاج نہیں رہتی، کیوں کہ وہ راستہ زیادہ مقدم ہے اس چیز سے جس نے اسے پہلے پہل اس پر روانہ کیا۔[۳۱]

حواشی و تعلیقات

۱۔ مولوی عبدالحق (مرتب)، ''مقدمہ''مشمولہ ''سب رَس'' از مُلّا وجہی، (کراچی: انجمن ترقّیِ اُردو پاکستان، ۱۹۵۳ء)، ص ۱۰، ۳۷، اشاعتِ ثانی

۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ''اردو کی نثری داستانیں''، (کراچی: انجمن ترقّیِ اُردو پاکستان، ۲۰۱۴ء)، ص ۴۲۔۴۳، اشاعتِ سوم

۳۔ (الف) محمد سلیم الرحمٰن (مرتب)، ''مقدمہ'' مشمولہ ''تواریخِ راسلس'' از سیّد کمال الدین حیدر، (لاہور: مجلسِ ترقّیِ اَدب، ۲۰۰۷ء)، ص ۷، اشاعتِ اوّل

(ب) ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی (مرتب)، ''مقدمہ''مشمولہ ''تواریخِ ریسلاس شہزادۂ حبش''، (اعظم گڑھ: ناشر مرتب، دسمبر ۱۹۸۳ء)، ص ۹

۴۔ en.m.wikipedia.org/wiki/paulo_coelho (مورخہ یکم مئی ۲۰۲۲ء، شب ۱۱ بجے)

۵۔ سعید احمد (مترجم)، ''عرضِ مترجم''مشمولہ ''تیر انداز''(The Archer) از پاؤلو کویلہو (Paulo Coelho)، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۱ء)، ص ix

۶۔ ایضاً، ''گریہ بر کنارِ دریا''(By The River Piedra)، ایضاً، ص ۷

۷،۸۔ ایضاً، ص ۷

۹۔ ایضاً، ص ۷، ۸

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ''، مشمولہ ''تعبیر کی شرح''، (کراچی، اکادمی بازیافت، اپریل ۲۰۱۴ء)، ص ۱۴۳

۱۱۔ سعید احمد (مترجم)، ''عرضِ مترجم''مشمولہ ''گِریہ بر کنارِ دریا''، ص ۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۱۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ''، ص ۱۴۱، ۱۴۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۱۵۔ ممتاز شیریں، ''حرفِ آغاز'' مشمولہ ''نیا دور''، کراچی، شمارہ ۲۰-۲۱، بحوالہ ڈاکٹر تنظیم الفردوس (ترتیب و مقدمہ نگار)، ''مقدمہ'' مشمولہ ''مشرق و مغرب کی کہانیاں''، از ممتاز شیریں (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۱۷ء)، ص ۲۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ''، ص ۱۴۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۲۰۔ پاؤلو کویلہو (Paulo Coelho)، ''گِریہ بر کنارِ دریا''(By The River Piedra)، مترجم سعید احمد، ص ۱۱۲

ISSN: 2519-6332 (Print) ❄ ISSN: 2708-1915 (Online)

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۲۲۔ انتظار حسین، ”افسانوی ادب کے ترجمے“، مشمولہ ”نظریے سے آگے“، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۸۵، ۱۸۶

۲۳۔ پاؤلو کویلہو (Paulo Coelho)، ”تیر انداز“ (The Archer)، مترجم سعید احمد، ص ۴، ۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۵، ۲۶۔ انتظار حسین، ”افسانوی ادب کے ترجمے“، ص ۱۸۵

۲۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ”دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ“، ص ۱۳۴

۲۸۔ پاؤلو کویلہو (Paulo Coelho)، ”تیر انداز“ (The Archer)، مترجم سعید احمد، ص ۴۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۸۵

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۲

مآخذ

۱۔ اعظمی، اشفاق احمد، ڈاکٹر (مرتب)، ”مقدمہ“ مشمولہ ”تواریخِ ریسلاس شہزادۂ حبش“، اعظم گڑھ: ناشر مرتب، دسمبر ۱۹۸۳ء

۲۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ”اردو کی نثری داستانیں“، کراچی: انجمنِ ترقّیِ اُردو پاکستان، ۲۰۱۴ء، اشاعتِ سوم

۳۔ حسین، انتظار، ”افسانوی ادب کے ترجمے“، مشمولہ ”نظریے سے آگے“، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۴۔ سعید احمد (مترجم)، ”عرضِ مترجم“ مشمولہ ”تیر انداز“ (The Archer) از پاؤلو کویلہو (Paulo Coelho)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۱ء

۵۔ ———، ”گریہ بر کنارِ دریا“ (By The River Piedra)، ———، ———

۶۔ سلیم الرحمٰن، محمد (مرتب)، ”مقدمہ“ مشمولہ ”تواریخِ راسلس“ از سیّد کمال الدین حیدر، لاہور: مجلسِ ترقّیِ اَدب، ۲۰۰۷ء، اشاعتِ اوّل

۷۔ شیریں، ممتاز، ”حرفِ آغاز“ مشمولہ ”نیا دور“، کراچی، شمارہ ۲۰-۲۱، بحوالہ ڈاکٹر تنظیم الفردوس (ترتیب و مقدمہ نگار)، ”مقدمہ“ مشمولہ ”مشرق و مغرب کی کہانیاں“، از ممتاز شیریں، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۱۷ء

۸۔ عبدالحق، مولوی (مرتب)، ”مقدمہ“ مشمولہ ”سب رَس“ از مُلّا وجہی، کراچی: انجمنِ ترقّیِ اُردو پاکستان، ۱۹۵۳ء، اشاعتِ ثانی

۹۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، ”دریافت اور بازیافت: ترجمے کا معاملہ“، مشمولہ ”تعبیر کی شرح“، کراچی، اکادمی بازیافت، اپریل ۲۰۱۴ء

۱۰۔ کویلہو، پاؤلو (Paulo Coelho)، ”گریہ بر کنارِ دریا“ (By The River Piedra)، مترجم سعید احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۱ء

۱۱۔ ———، ”تیر انداز“ (The Archer)، مترجم سعید احمد، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۱ء

ویب سائٹ

1. en.m.wikipedia.org/wiki/paulo_coelho